

تفہیم القرآن

الشعراء

(۵)

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں؟
میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت
کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

لہ تعالٰی کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن مبدوم صفحہ ۴۷ تا ۵۰۔ ۲۲۹ تا ۳۵۳۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۶۲۶
مزید تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات بھی پیش نظر رہیں: النمل رکوع ۴۔ النبیات
رکوع ۲۔ القمر رکوع ۲۔ الحاقة رکوع ۱۔ الفجر۔ الشمس۔

اس قوم کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ
عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی، جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (الاعراف)۔ مگر اس کی ترقی
ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیار زندگی بند سے بلند تر اور معیار اہمیت
پست سے پست تر ہونا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قہر اور پہاڑوں میں ایوڑ اور
اجنبطہ کے غاروں جیسے محل بن رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا اور زمین
ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی
بڑائی کے گمنام میں سرشار تھے حضرت صالح کی دعوت حق نے اگر اسل کی ترقی کے کھوڑے لوگوں کو کیا اور
اپنے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِي اٰمَنَّا غَرِبْنَا كَقَوْمٍ وَّجَس
چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے ۵

کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیتے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخر یہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام

۱۱۱ حضرت صالح کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کی شہادت خود اس قوم کے لوگوں کی زبان سے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے: قَالُوا يَا صَالِحُ تَنَا كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا (سورہ زکریٰ ۶) "انہوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے تو ہم ہمارے درمیان ایسے آدمی تھے جس سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں"

۱۱۲ یعنی کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہارا یہ عیش دائمی اور بادی ہے؟ کیا اس کو کبھی زوال آنا نہیں ہے؟ کیا تم سے کبھی ان نعمتوں کا حساب نہ لیا جائیگا اور کبھی ان اعمال کی باز پرس نہ ہوگی جن کا تم آریاب کہ رہے ہو؟

۱۱۳ اصل میں لفظ هَضِيم استعمال ہوا ہے جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو پھلوں سے لدر کر جھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔ ۱۱۴ جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عالی شان محل بناتے تھے چنانچہ سورہ فجر میں جس طرح عاد کو ذَاتِ الْعِمَادِ (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح ثمود کا ذکر اس خصوصیت کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ، وہ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے، تَتَّخِذُونَ مِنْ سُورِهَا بُيُوتًا (الاعراف، رکوع ۱۰)۔ اور ان تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فُرُجِین سے روشنی ڈالتا ہے یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قوت اور اپنے کمالات فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے

لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا "تو محض ایک سحرزودہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے یہ صلاح نے کہا یہ اونٹنی ہے۔ ایک دن اس کے پانی پلینے کا ہے اور ایک دن قہر

داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف امراء اور اہل ثروت رہنے کے لیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یا دکاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

۱۷ یعنی اپنے ان امراء و رؤساء اور اُن رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظام زندگی چل رہا ہے۔ یہ سرف لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں پچاند کر شر بے ہمار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلاتے گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں، میری امانت و دیانت کو تم پہلے سے جانتے ہو، اور میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اٹھا ہوں۔ یہ تمہارے مختصر متنوع جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدنی و اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

۱۸ "سحرزودہ" یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔ قدیم تصورات کے مطابق پاگل پن یا تو کسی جن کے اثر سے لاحق ہوتا تھا یا باوجود کے اثر سے۔ اس لیے وہ جسے پاگل کہنا چاہتے تھے اس کو یا تو "مجنون" کہتے تھے یا مسکور اور مستحور۔

۱۹ یعنی بظاہر تو ہم میں اور تجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ ہم تجھے خدا کا فرستادہ مان لیں لیکن اگر تو اپنے مامور اللہ اور منزل من جانب اللہ ہونے کے دعوے میں سچا ہے تو کوئی ایسا محسوس معجزہ پیش کر جس سے ہم یقین آجائے کہ واقعی کائنات کے خالق اور زمین و آسمان کے مالک نے تجھ کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

۲۰ معجزے کے مطالبے پر اونٹنی پیش کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام اونٹنی نہ تھی

سب کے پانی لینے کا۔ اس کو کبھی نہ چھینا اور نہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلیگا۔ مگر انہوں نے جیسی ہر عرب کے پاس وہاں پانی باقی تھی، بلکہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خلقت میں کوئی ایسی چیز تھی جسے معجزے کی طلب پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ اگر حضرت صالح اس مطالبے کے جواب میں یونہی کسی آدمی کو پکڑ کے کھڑا کر دیتے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت فضول حرکت ہوتی جس کی کسی پیغمبر تو درکنار، ایک عام معقول آدمی سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات یہاں تو صرف میاق کلام ہی کے اقتدار سے سمجھ میں آتی ہے لیکن دوسرے مقامات پر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس اوٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں فرمایا گیا **هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ كُتُبًا**، یہ اللہ کی آدمی تمہارے لیے نشانی کے طور پر ہے۔ اور سورہ بنی اسرائیل میں اس سے بھی زیادہ پُر زور الفاظ میں ارشاد ہوا ہے :-

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ كَذِبًا
بِهَا الْأَدْوَانُ، وَإِنَّا نَمُودُ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً
فَظَلَمُوا بِهَا، وَمَا نُرْسِلُ إِلَّا الْخَوِیًّا
ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات
نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں، اور ہم تمہارے سامنے
آنکھوں دیکھتے اوٹنی لے آئے پھر بھی انہوں نے اس کے
ساتھ ظلم کیا۔ نشانیاں تو ہم خوف دلانے ہی کے لیے
بھیجتے ہیں تمہارا دکھانے کے لیے تو نہیں بھیجتے۔

(رکوع ۱۶)

اس پر مزید وہ چیلنج ہے جو اوٹنی کو میدان میں لے آنے کے بعد اس کا فر قوم کو دیا گیا۔ اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ صرف ایک معجزہ ہی پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جاسکتا تھا۔

نلے یعنی ایک دن تنہا یہ اوٹنی تمہارے کنوؤں اور چھتوں سے پانی پیے گی اور ایک دن ساری قوم کے آدمی اور جانور سب گئے۔ خبردار، اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی لینے کی جگہ ٹھکنے نہ پائے۔ یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا۔ لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی ہی کے مسئلے پر خون خرابے ہو جاتے تھے، قبیلہ قبیلے سے لڑ جاتا تھا اور جان جو کھوں کی بازی لگا کر کسی کنوئیں یا چشمے سے پانی لینے کا حق حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سرزمین میں کسی شخص کا اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ ایک دن میری اکیلی اوٹنی پانی پیے گی اور باقی ساری قوم کے آدمی اور جانور صرف دوسرے دن ہی

اس کی کوچیں کاٹ دیں اور آخر کار بچھپاتے رہ گئے۔ عذاب نے انہیں آلیا۔

پانی لے سکیں گے، یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پوری قوم کو لڑائی کا چیلنج دے رہا ہے۔ ایک زبردست لشکر کے بغیر کوئی آدمی عرب میں یہ بات زبان سے نہ نکال سکتا تھا اور کوئی قوم یہ بات اُس وقت تک نہ سن سکتی تھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ رہی ہو کہ چیلنج دینے والے کی پشت پر اتنے شمشیر زن اقدیرانماز موجود ہیں جو مقابلے پر اٹھنے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ لیکن حضرت صالح نے بغیر کسی لاؤ لشکر کے تنہا اٹھ کر یہ چیلنج اپنی قوم کو دیا اور قوم نے صرف یہ کہ اس کو کانٹا کر سنا بلکہ بہت دلوں تک ڈر کے ماسے وہ اس کی تعمیل بھی کرتی رہی۔

سورہ اعراف اور سورہ ہود میں اس پر آنا اضافہ اور ہے کہ هٰذِهِ نَارُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَمَنْ رَدَّهَا تَأْكُلْ فِي اَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوْهَا بَسُوْجٍ ۗ يٰۤاٰثِمِيْ تَهَارِيْ لِيْ سَنَاطِيْ كَ طُوْرِ پَرِیْ، چھوڑ دو اسے کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے، ہرگز اسے بڑے ارادے سے نہ چھوڑنا یعنی چیلنج صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ہر دوسرے روز اکیلی یہ اوثنی دن بھر سارے علاقے کے پانی کی اجارہ دار رہے گی، بلکہ اس پر فرید یہ چیلنج بھی تھا کہ یہ تمہارے کھیتوں اور باغوں اور نجاستانوں اور چراگاہوں میں ذندانے پھرگی، جہاں چاہیگی جائیگی، جو کچھ چاہے گی کھائے گی، خبردار جو کسی نے اسے چھڑا۔

اللہ یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت انہوں نے حضرت صالح سے یہ چیلنج سنا اسی وقت وہ اوثنی پر پل پڑے اور اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں، بلکہ کافی مدت تک یہ اوثنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی، لوگ اس پر دلوں میں اٹکتے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کا۔ سورہ شمس میں اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اِذَا تَبَعَتْ اَشْفَاہَا ۗ وَجَبَّ اَثْمَا ۗ اِس قَوْمٍ کَا سَب سے زیادہ شفیق آدمی اور سورہ قمر میں فرمایا گیا ہے فَنَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَسَ ۗ اِنھوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی، آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمے لے کر اٹھا اور اس نے کوچیں کاٹ ڈالیں۔

آلۃ قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اوثنی

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے

کہ تیرا سب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع

لو طکی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی لو طے ان سے کہا تھا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں میں اللہ نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو۔

مارٹوالی گئی تو حضرت صالح نے اعلان کیا: **مَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ**، تین دن اپنے گھروں میں فرسے کر لو (ہو۔ ۶)۔ اس نوٹس کی مدت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح کھلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سوکھی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین نضر انہیں اس آفت سے بچا سکے نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔ **اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْكُمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوا الْهٰسِبِيْنَ الْمُحْتَضِرِ الْقَوْمِ (۲) - فَآخَذْنَاهُمُ الرِّجَّةَ فَآوَىٰ فِيْ دَارِهِمْ خَبِيْثِيْنَ (اعراف ۱۰) - فَآخَذْنَاهُمَا لَصِيْحَةً مُّصْبِحِيْنَ فَمَا اَعْنٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَلْمِزُوْنَ**

۱۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۱ تا ۵۲ - ۲۵۵ تا ۲۵۹ - ۵۱۱ تا ۵۱۵ مزید

تفصیلات کے لیے: الانبیاء رکوع ۵ - النمل رکوع ۴ - العنکبوت رکوع ۲ - الصافات رکوع ۴ - القمر رکوع ۲ -

۱۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے اس غرض کے

لیے چھانٹ لیا ہے کہ ان سے خواہش نفس پوری کرو۔ حالانکہ دنیا میں بکثرت عورتیں موجود ہیں۔ دوسرا مطلب

یہ ہے کہ دنیا بھر میں ایک تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، ورنہ

انسانوں میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں ہے بلکہ حیوانات میں سے بھی کوئی جانور یہ کام نہیں کرتا۔ اس

دوسرے مفہوم کی صراحت سورہ اعراف اور سورہ عنکبوت میں یوں کی گئی ہے: **اِنَّا لَوْنُ الْعٰجِئَةِ**

انہوں نے کہا "اے لوط، اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستریوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا" اس نے کہا "تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ گڑھے میں ہیں میں ان میں شامل ہوں۔ اے پروردگار! مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے

مَا سَبَقَكَ بِقَامِنِ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ، کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا؟

۱۵۔ اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو بیویاں خدانے پیدا کی تھیں انہیں چھوڑ کر تم غیر فطری ذریعے یعنی مردوں کو اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ان بیویوں کے اندر خدانے اس خواہش کی تکمیل کا جو فطری راستہ رکھا تھا اسے چھوڑ کر تم غیر فطری راستہ اختیار کرتے ہو۔ اس دوسرے مطلب میں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ وہ ظالم لوگ اپنی عورتوں سے بھی خلاف وضع فطری فعل کا ارتکاب کرتے تھے۔

۱۶۔ یعنی تمہارا صرف یہی ایک جرم نہیں ہے، تمہاری زندگی کا تو سارا منجانبی حد سے زیادہ بگڑ چکا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے اس عام بگاڑ کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے

اتَّاتُونَ الْعَالِحَةَ وَأَنْتُمْ تَبْصِرُونَ وَالنَّارُ - کیا تمہارا یہ حال ہو گیا ہے کہ کھلم کھلا دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے معش کام کرتے ہو؟ اِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيَكُمُ الْمُنْكَرَ (العنکبوت)۔ کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ مردوں سے مباشرت کرتے ہو، راستوں پر داکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں علانیہ برے کام کرتے ہو؟ درمیان تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر القرآن جلد دوم صفحہ ۵۱۲-۵۱۳۔

۱۷۔ یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے، یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے، یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے وہ ہماری بستریوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کر لگا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہوگا۔ سورہ اعراف اور سورہ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت لوط کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شریر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ اَحْوَجُوا اِلَ لُّوطٍ مِّنْ

نجات دے۔ آخر کار ہم نے اسے اوداس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا، بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اودان پر برسائی ایک برسات، بڑی ہی بڑی بارش تھی جو ان ڈراٹے جانے والوں پر نازل ہوئی تھی۔

قَرَّبْتِكُمْ أَهْمًا نَاسٌ تَيَطَّهَّرُونَ، لوط اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاکیزہ تھے ہیں۔ ان صالحین کو باہر کاراستہ دکھاؤ۔

مثلاً اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے اعمالِ بد کے بڑے انجام سے بچا۔ اور یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ اس بد کردار بستی میں جو اخلاقی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی چھوت کہیں ہماری آل و اولاد کو نہ لگ جائے، اہل ایمان کی اپنی نسلیں کہیں اس بگڑے ہوئے ماحول سے متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے پروردگار ہمیں اس ہر وقت کے عذاب سے نجات دے جو اس ناپاک معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے ہم پر گزر رہا ہے۔

۹ لہ اس سے مراد حضرت لوط کی بیوی ہے۔ سمدہ تحریم میں حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ كَا تَا تَحْتِ عَبْدَيْنِ مِّنْ عِبَادِنَا صَالِحِينَ فَخَاتَمًا (رکوع ۲۲) یہ دونوں عورتیں ہمارے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں مگر انہوں نے ان کے ساتھ خیانت کی یعنی دونوں ایمان سے خالی تھیں اور اپنے نیک شوہروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان دونوں نے اپنی کافر قوم کا ساتھ دیا۔ اسی بنا پر جب اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا اور حضرت لوط کو حکم دیا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمادی کہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جاؤ، فَاسْتَرِبَا هَلِكًا بَقِيعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يُلْتَقِيَتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرًا تَكُنَّ إِنَّهُ مَصِيْبُهُمَا مَا أَصَابَهُمْ (رمود ۷) پس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لیکر نکل جا اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جا، اُس پر وہی کچھ گزرنی ہے جو ان لوگوں پر گزرتی ہے۔ اس بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوط جب رات کے پچھلے پہر اپنے بال بچوں کے

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے

لے کر نکل گئے تو صبح پوچھتے ہی یکایک ایک زور کا دھماکا ہوا (فَاخَذْنَهُمُ اللَّيْلَةَ مُشْرِقِينَ)۔ ایک ہونک زلزلے نے ان کی بستریوں کو لٹ پٹ کر کے رکھ دیا (رَجَعْنَا عَلَیْهَا سَافِلًا)، ایک زبردست آتش نشانی انفجار سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے (رَوَانَا عَیْنًا حِجَازَةَ قَدْ سَجَّيْلٍ مِّنْخُودٍ) اور ایک طوفانی ہوا سے بھی ان پر پتھر اڑا دیا گیا (رَانَا اَرْسَلْنَا عَلَیْكُمْ حَاصِبًا)۔

بائبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریریں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بحیرہ مردار (DEAD SEA) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج اتھانی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی تپہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانے میں نہایت آب و علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں مبراہ شدہ قبروں کے آثار ملتے ہیں حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہا سکے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوشحالی کا دور سنہ ۲۳۰۰ قبل مسیح سے سنہ ۱۹۰۰ قبل مسیح تک رہا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائبل میں سیدیم کی وادی کہا گیا ہے، جس کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ ”وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی“ (سپیدائش باب ۱۳-۱۰-آیت ۱۰) موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بحیرہ مردار کے اندر غرق ہے، اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں بحیرہ مردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے شرق ارض کے موجودہ شہر الکلیک کے سامنے مغرب کی جانب اس بحرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما ”اللسان“ پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے

کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ہے



اشفاق اردون

رہے ممتحنہ نقشے میں ہم نے آڑی کیوں سے نمایاں کیا ہے، پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی تھی جس میں قوم لوط کے بڑے بڑے بہر سعدم، عمروہ، اذمرہ وغیرہم اور مشرقات تھے۔ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بحیرہ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اُمتلا حصہ ہے مگر رومی عہد میں یہ اتنا اُمتلا تھا کہ لوگ انسان سے مغربی ساحل تک چل کر پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں۔

۱۰۰ اکلک
۱۰۰ موتہ

اشفاق
قوم لوط کا علاقہ

بائبل اور قدیم یونانی و لاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نَقطہ (پٹرولی) اور اسٹاٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیر زمین پٹرولی اور گیسوں کا پتہ ملتا ہے۔ طبعیات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرولی، گیس اور اسٹاٹ زمین سے نکل کر بھڑک اٹھے اور سارا علاقہ جھک سے اُٹ گیا۔ بائبل کا بیان ہے

اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ شعیب نے ان سے کہا تھا ”کیا تم ڈرتے نہیں؟“

کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیم جب جبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے (پیدائش باب ۱۹- آیت ۲۸)

۱۲۔ اصحاب الایکہ کا مختصر ذکر سورہ الحجج میں پہلے گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم، صفحہ ۵۱۵)۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مدینہ اصحاب الایکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورہ اعراف میں حضرت شعیب کو اہل مدینہ کا بھائی فرمایا گیا ہے (وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا)، اور یہاں اصحاب الایکہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ إِذْ قَالَ لَهُمُ شُعَيْبٌ يٰرَبِّكُمْ أَنْتُمْ قَوْمُ اللَّهِ، انہیں نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم

قرار دیتے ہیں، کیونکہ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحاب مدینہ کے بیان ہوئے ہیں وہی یہاں اصحاب الایکہ کے بیان ہو رہے ہیں، حضرت شعیب کی دعوت و نصیحت بھی کیساں ہے، اور آخر کار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدینہ اور اصحاب الایکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر میں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطوعہ کے بطن سے تھی وہ عرب اور



میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو میں اس
اسرائیل کی تاریخ میں بنی قبطیہ کے نام سے معروف تھی۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا، مدیان بن
ابراہیم کی نسبت سے مدیانی، یا اصحاب مدین کہلایا، اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک
اور وہاں سے جزیرہ نماے سینا کے آخری گوشے تک بحرِ فلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر
مقام شہر مدین تھا جس کی جائے وقوع ابراہم نے خلیج عقبہ کے مغربی کنارے آئینہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ
دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قبطیہ جن میں بنی دوان (DEDANITES) نسبتاً زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب
میں تیماء اور تبوک کے درمیان آباد ہوئے اور ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔
(یا قوت نے معجم البلدان میں لفظ ایکہ کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہل تبوک میں عام طور
پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایکہ تھی)۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی
نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل
تھے، بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی
باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قبطیہ کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک
ہی طرح کی تجارتی لے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ
یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ لوگ بعل فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے
تو ان کے مذہبی انھوں نے شرک اور زنا کاری کی وبا پھیلا دی گئی باب ۲۵ آیت ۱۵ باب ۲۱ آیت ۱۶-۱۷ پھر یہ لوگ بنی لواتی بتا
کی ان ڈبیری شاہلوں پر آیا دیکھے جو کچھ شام اور خلیج فارس کے مغربی طرف ماتی تھیں۔ ان شاہلوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے
بڑے پیمانے پر رہنری کا سلسلہ پھار رکھا تھا، دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے
دیتے تھے، اور بنی لواتی تجارت پر خود قبضہ کرنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا
تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: **وَإِنَّمَا كُنَّا لَكُمْ فِتْنَةً لِّتَأْتُوا**
أَصْحَابَ الْاَيْكَةِ كَهَلِي شَاهِ رَاهِ پَرَا بَادِ تَنَهِي "اور ان کی رہنری کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے: **وَلَا تَقْدِرُوا**

کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں میرا اجر تو رب العلمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھانا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلانے پھرو اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔ انہوں نے کہا تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان بسم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا اگر ادرے، شعیب نے کہا "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو" انھوں نے اسے جھٹلایا۔ آخر کار چھتری واسے دن کا عذاب ان پر آگیا، اور وہ

بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُونَ ۚ اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے کے لیے نہ بھیجو، یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔

حضرت شعیب اور اہل مدین کے قحط کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵ تا ۵۸ - ۲۵۹ تا ۲۶۵ - اور سورہ محکموت رکوع ۴ -

۲۲ یعنی عذاب نازل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے اور وہ تمہارا کرتوت دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر وہ تمہیں اس عذاب کا مستحق سمجھے گا تو خود نازل فرما دیگا۔ اصحاب الایکہ کے اس مطالبے اور حضرت شعیب کے اس جواب میں کفار قریش کے لیے بھی ایک تندی تھی وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مطالبے کرتے تھے، اَوْ تَسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتُمْ عَلَيْنَا كِسْفًا، "یا پھر اگر ادرے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے" (سبئ اسرائیل - ۱۰)۔ اس لیے ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایسا ہی مطالبہ اصحاب الایکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اُس کا جو جواب انہیں ملا وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہاری طلب کا جواب بھی ہے۔

۲۳ اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھیں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک باردن بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک باران عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب الایکہ کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے عذاب

بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں اور حقیقت یہ ہے

کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ہے

یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لیکر تیرے دل پر امانت دار روح اتنی ہے

سے مختلف تھی۔ یہ جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے: پھری والے عذاب سے ہلاک ہوئے، اور ان پر عذاب ایک حمل کے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاخَذْتَهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جثثین، اور وَاخَذَتِ الْمَذِينِ ظَلْمَهُمُ الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جثثین)۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش درست نہیں ہے بعض مفسرین نے عذاب یوم الظلہ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثک من العلماء ما عذاب یوم الظلہ فکذبہ، علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو۔

۲۳ تاریخ کی بیان ختم کر کے اب سلسلہ کلام اسی مضمون کی طرف پھرتا ہے جس سے سورۃ کا آغاز فرمایا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر لپٹ کر پہلے رکوع کو دیکھ لینا چاہیے۔

۲۵ یعنی یہ کتاب مبین جس کی آیات یہاں سنائی جا رہی ہیں، اور یہ ”ذکر“ جس سے لوگ حنتہ

موڑ رہے ہیں کسی انسان کی من گھڑت چیز نہیں ہے، اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصنیف نہیں کیا ہے، بلکہ یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے۔

۲۶ مراد میں جبریل علیہ السلام، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِیلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ الرَّبِّمُبْرِکِ (رکوع ۱۲) کہہ دے کہ جو کوئی دشمن ہے جبریل کا تو اسے معلوم ہو کہ اسی نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے تیرے دل پر نازل کیا ہے۔

یہاں ان کا نام لینے کے بجائے ان کے لیے روح امین رمانت دار روح کا لقب استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ رب العالمین کی طرف سے اس تنزیل کو لیکر کوئی مادی طاقت نہیں آئی ہے جس کے

تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلق خدا کو متنبہ کرنے والے میں، صاف صاف عربی زبان میں) اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے۔ کیا ان دونوں کے لیے یہ کوئی متشانی انداز تیسرے تہذیب کا امکان ہو، بلکہ وہ ایک خاص روح ہے بلاشبہ مادرت، اور وہ پوری طرح ان سے خدا کا پیغام جیسا اس کے سپرد کیا جاتا ہے ویسا ہی بلا کم و کاست پہنچا دیتی ہے، اپنی طرف سے کچھ بڑھایا گیا دینا یا بطور خود کچھ تصنیف کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

بلکہ اس فقرے کا تعلق "امانت واروح انری ہے" سے بھی ہو سکتا ہے اور متنبہ کرنے والے میں سے بھی پہلی صلاحت میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ امانت واروح اسے صاف صاف عربی زبان میں بلائی ہے، اور دوسری صورت میں معنی یہ ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان انبیاء میں شامل ہوں جنہیں عربی زبان میں خلق خدا کو متنبہ کرنے کے لیے مامور فرمایا گیا تھا یعنی ہمد، صالح، اسماعیل اور عیسیٰ علیہم السلام دونوں صورتوں میں تصور کلام ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ رب الخلقین کی طرف سے یہ تعلیم کی مراد یا جاتی زبان میں نہیں آئی ہے، نہ اس میں کوئی حصے یا چھتیاں کی کسی گنگ زبان استعمال کی گئی ہے، بلکہ یہ ایسی صاف اور فصیح عربی زبان ہے جس کا مفہوم و مدعا ہر عرب اور ہر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہو سہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے منہ موڑ رہے ہیں ان کے لیے یہ عند کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اس تعلیم کو سمجھ نہیں سکے ہیں، بلکہ ان کے اعراض و انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اسی بیاری میں تجللا ہیں جس میں فرعون مصر اور قوم نوح اور قوم لوط اور عاد و ثمود اور اصحاب الایکہ مبتلا تھے۔

عقل یعنی یہی ذکر اور یہی تہذیب اور یہی الہی تعلیم سابق کتب آسمانی میں بھی موجود ہے۔ یہی خدا نے واحد کی زندگی کا بلا واپسی آخرت کی زندگی کا عقیدہ، یہی انبیاء کی پیروی کا طریقہ ان سب میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ سب کتابوں میں جو خدا کی طرف سے آئی ہیں، شرک کی مذمت ہی کرتی ہیں، مادہ پرستانہ نظریہ حیات کو چھوڑ کر اسی برحق نظریہ حیات کی طرف دعوت دیتی ہیں جس کی بنیاد خدا کے حضور انسان کی چوہدہی کے تصور پر ہے، اور انسان سے ہی مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر ان الہی احکام

نہیں ہے کہ اسے علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں؟ (لیکن ان کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ) کی پیروی اختیار کرے جو انبیاء علیہم السلام لائے ہیں۔ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نرالی نہیں جو دنیا میں پہلی مرتبہ قرآن ہی پیش کر رہا ہو اور کوئی شخص یہ کہہ سکے کہ تم وہ بات کر رہے ہو جو ان گلوں پھیلوں میں سے کسی نے کبھی نہیں کی۔

یہ آیت متجملہ ان دلائل کے ہے جو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی اس قدیم رائے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ لے تو نماز ہو جاتی ہے، خواہ وہ شخص عربی میں قرآن پڑھنے کی قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ نبلے استدلال علامہ ابوبکر جصاص کے الفاظ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ارشاد فرما رہا ہے کہ یہ قرآن پھیلی کتابوں میں بھی تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں وہ عربی الفاظ کے ساتھ نہ تھا، لہذا کسی دوسری زبان میں اس کے مضامین کو نقل کر دینا اسے قرآن ہونے سے خارج نہیں کر دیتا (احکام القرآن جلد سوم، صفحہ ۲۹)۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بالکل ظاہر ہے۔ قرآن مجید ہو یا کوئی دوسری آسمانی کتاب، کسی کے نزول کی کیفیت بھی یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے عرف معانی نبی کے دل پر القا کر دیئے ہوں اور نبی نے پھر انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔ بلکہ ہر کتاب جس زبان میں بھی آئی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معنی اور لفظ دونوں کے ساتھ آئی ہے۔ اس لیے قرآن کی تعلیم جن پھیلی کتابوں میں بھی تھی، انسانی الفاظ میں نہیں، خدائی الفاظ ہی میں تھی، اور ان میں سے کسی کے ترجمہ کو بھی کتاب اللہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اصل کا قائم مقام ٹھہرایا جاسکے۔ رہا قرآن تو اس کے متعلق بار بار تصریح فرمایا گیا ہے کہ وہ لفظاً لفظاً عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا، رِيسْف (۱) وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (الرعد-۵) قَدْ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا عَرَبِيًّا عَرَبِيًّا (الرعد-۳)**۔ اور خود اسی آیت زیر بحث سے پہلے منقلاً فرمایا جا چکا ہے کہ روح الامین اسے زبان عربی میں نیکر اترا ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کوئی ترجمہ جو کسی انسان نے دوسری زبان میں کیا ہو وہ بھی قرآن ہی ہے؟ اور اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے قائم مقام ہونگے معلوم ہوتا ہے کہ استدلال کی اس کمزوری کو بعد میں خود امام ممدوح نے بھی محسوس فرمایا تھا، چنانچہ معتبر روایات سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے

اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سناتا

اس مشائے میں اپنی رائے سے رجوع کر کے امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے قبول کر لی تھی، یعنی یہ کہ جو شخص عربی زبان میں قرأت پڑھتا رہے وہ اس وقت تک نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے جب تک اس کی زبان عربی الفاظ کے تلفظ کے قابل نہ ہو جائے، لیکن جو شخص عربی میں قرآن پڑھ سکتا ہو وہ اگر قرآن کا ترجمہ پڑھ سکا تو اس کی نماز نہ ہوگی حقیقت یہ ہے کہ صاحبین نے یہ رعایت دراصل ان عجمی نو مسلموں کے لیے تجویز کی تھی جو اسلام قبول کرتے ہی فوراً عربی زبان میں نماز ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکتے تھے، اور اس میں نیلئے استدلال یہ نہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ بھی قرآن ہے، بلکہ ان کا استدلال یہ تھا کہ جس طرح اشارے سے رکوع و سجود کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو رکوع اور سجود کرنے سے عاجز ہو اسی طرح غیر عربی میں نماز پڑھنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو عربی تلفظ پڑھتا نہ ہو، اور علیٰ ہذا القیاس جس طرح عجز رفع ہو جانے کے بعد اشارے سے رکوع و سجود کرنے والے کی نماز نہ ہوگی اسی طرح قرآن کے تلفظ پڑھتا نہ ہو جانے کے بعد ترجمہ پڑھنے والے کی نماز بھی نہ ہوگی۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مبسوط سمرخسی جلد اول ص ۳۷ - فتح القدیر و شرح حناہ علی الہدایہ ج ۱، صفحہ ۱۹۰ - ۲۰۱ -)

۲۹ یعنی علمائے بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کتب آسمانی میں دی گئی تھی۔ اہل مکہ خود علم کتاب سے نا آشنا تھے، بنی اسرائیل کے اہل علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی الوکھا اور زوالہ ذکر نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمد بن عبداللہ نے لا کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہو بلکہ ہزار ہا برس سے خدا کے نبی ہی ذکر پے در پے لاتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ تنزیل بھی اسی رب العلیین کی طرف سے ہے جس نے پھلی کتابیں نازل کی تھیں؟

سیرت ابن ہشام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے زمانہ نزول سے قریب ہی یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ حبش سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی دعوت سن کر ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجد حرام میں کفار قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں حضور نے

تب بھی یہ مان کر نہ دیتے۔ اسی طرح ہم نے اس رد کو کہ جو ہر مومن کے دلوں میں گزرا ہے۔ وہ اس کی

جواب میں ان کو قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسی وقت آپ کے رسول پر حق ہونے کی تصدیق کر کے آپ پر ایمان لے آئے۔ پھر جب وہ حضور کے پاس سے اٹھے تو ابوہریرہؓ نے ان کے ہتھکڑوں کے ساتھ ان سے ملا اور انہیں سخت طاقت کی۔ اس نے کہا تم سے زیادہ احمق قافلہ بیان کبھی نہیں آیا۔ نامرادو، تمہارے ہاں کے لوگوں نے تو تمہیں اس لیے بھیجا تھا کہ اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ، مگر ابھی اس سے طے ہی نہیں ہے کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھے۔ وہ شریف لوگ ابوہریرہؓ کی اس زبردستی پر الجھنے کے بجائے سلام کر کے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے، آپ اپنے دین کے عقائد ہیں اور ہم اپنے دین کے عقائد، ہمیں جس چیز میں اپنی خیر نظر آئی اسے ہم نے اختیار کر لیا اور مردوم سے حضور (۳۲)۔

اسی واقعہ کا ذکر سورہہ قصص میں آیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ رَبِّهٖ يَوْمُئِذٍ وَّ اٰذًا مُّشِيْلًا عَلَيْهِمْ قَالُوْا اَمْثَابِهٖ اِنَّهٗ اَلْحَقُّ وَاِنَّا لَنٰتَاْمِنُ مِنْ قَبْلِهِ وَّ سٰبِقِيْنَ... وَاِذْ اَخْبَرْنَا الْمُضَرِّيْنَ اَنْ اَعْمٰلُكُمْ سٰوَةٌ وَاَنْتُمْ اَعْمٰلُكُمْ سٰوَةٌ فَاصْبِرُوْا فَاِنَّكُمْ بِاَعْيُنِنَا وَاَنْتُمْ اَعْمٰلُكُمْ سٰوَةٌ فَاصْبِرُوْا فَاِنَّكُمْ بِاَعْيُنِنَا

”جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ انہیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں تم ہم اس پر ایمان لائے، پر حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم اس سے پہلے بھی اس دین اسلام پر تھے... اور جب انہوں نے یہ سب سنا تو انہیں تو الجھنے سے پرہیز کر لیا اور بوسے ہمارے اعمال ہمارے جیسے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ پسند نہیں کرتے۔“

”تو یہی اب ابھی کی تو تم کا ایک آدمی انہیں عربی میں یہ کلام پڑھ کر سنا رہا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، عرب کی زبان سے عربی تقریر آدا ہونے میں آخر معجزہ کیا بات ہے کہ جو اسے خدا کا کلام نہیں، لیکن اگر یہی فصیح عربی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی غیر عرب پر بطور معجزہ نازل کر دیا، اور وہ ان کے سننے اور نہایت فصیح عربی لہجہ میں اس پر ہوتا تو یہ ایمان نہ لاسکتے کہ یہ معجزہ ہوا ہے۔ اس وقت یہ کہتے کہ اس پر کوئی حق آگیا ہے جو عربی کی زبان سے عربی ہوتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے

ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ عذاب الیم نہ دیکھ لیں۔ پھر جب وہ بے خبری میں ان پر آ پڑے گا اس وقت یہ کہیں گے کیا اب ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟

کہ جو شخص حق پسند ہوتا ہے وہ اس بات پر غور کرتا ہے جو اس کے سامنے پیش کی جا رہی ہو اور ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتا ہے کہ یہ معقول بات ہے یا نہیں۔ اور جو شخص ہٹ دھرم ہوتا ہے اور نہ ملنے کا ارادہ کر لیتا ہے وہ اصل مضمون پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اسے تو کرنے کے لیے طرح طرح کے جیلے پہلنے تلاش کرتا ہے۔ اس کے سامنے بات خواہ کسی طریقے سے پیش کی جائے، وہ بہر حال اسے جھٹلانے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کر لے گا۔ کفار قریش کی اس ہٹ دھرمی کا پردہ قرآن مجید میں جگہ جگہ فاش کیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ تم ایمان لانے کے لیے معجزہ دکھانے کی شرط آخر کس منہ سے لگاتے ہو، تم تو وہ لوگ ہو کہ تمہیں خواہ کوئی چیز دکھادی جائے تم اسے جھٹلاتے کے لیے کوئی بہانہ نکال لو گے کیونکہ وہ اصل تمہیں حق بات مان کر نہیں دینی ہے۔ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَابٍ فَلَمَسُوهُ يَأْتِيهِمْ لَعْنَةُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا إِسْحَارٌ مِّمَّنْ بَيْنَ الْأَنْعَامِ۔ (رکوع ۱) اگر تم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ وَكَوَفَّحْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَلْهَامًا فَرَّغُوا فِيهَا بِمَا كَانُوا يُعْرَضُونَ لَعَنُوا إِنَّمَا سَكَّرْنَا بِهَا بِلْغَتِنَا مَقُومًا مَسْحُورُونَ (الحجر۔ ۱) اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جاؤ کہ دیا گیا ہے۔

۱۳۰ یعنی یہ اہل حق کے دلوں کی طرح تسکینِ روح اور شفا کے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اتارتا بلکہ ایک گرم لوہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔

۱۳۱ ویسا ہی عذاب بھیسا وہ تو میں دیکھ چکی ہیں جن کا ذکر اوپر اس سورے میں گزرا ہے۔

۱۳۲ یعنی عذاب سامنے دیکھ کر ان کو یقین آئے گا کہ واقعی پیغمبر نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا اور اس وقت

کیا ہمارے عذاب کے لیے یہ لوگ جلدی چارہ ہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا، اگر ہم انہیں برسوں کی مہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آجائے جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامانِ بستی جو ان کو ملا ہوا تھا ان کے کس کام آئے گا؟
 دیکھو، ہم نے کبھی کسی بستی کو اس کے بغیر ملاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے خبردار کرنے والے تھی نصیحت اور کرنے کو موجود تھی۔ اور ہم ظالم نہ تھے۔

یہ حسرت کے ساتھ ہاتھ مل کر کہیں گے کہ کاش اب ہمیں کچھ مہلت مل جائے، حالانکہ مہلت کا وقت گزر چکا ہے۔
 ۳۴ اس فقرے اور اس سے پہلے کے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑا سا غور کر کے خود بھر سکتا ہے۔ عذاب کے لیے ان کے جلدی چمانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کے آنے کا کوئی اندیشہ نہ رکھتے تھے۔ انہیں بھروسہ تھا کہ جیسی چین کی بنسری آج تک ہم بجاتے رہے ہیں اسی طرح ہمیشہ بجاتے رہیں گے۔ اسی اعتماد پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو اور ہم تمہیں جھٹلا کر عذاب الہی کے مستحق ہو رہے ہیں تو لو ہم نے تمہیں جھٹلا دیا، اب لے آؤ اپنا وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے اچھا اگر بالفرض ان کا یہ بھروسہ صحیح ہی ہو، اگر ان پر فوراً عذاب نہ آئے، اگر انہیں دنیا میں مزے کرنے کے لیے ایک لمبی ڈھیل بھی مل جائے جس کی توقع پر یہ بھول رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ جب بھی ان پر عاد و ثمود یا قوم لوط اور اصحاب الالیکہ کی سی کوئی آفت نازل ہوتی ہے جس سے محفوظ رہنے کی کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے، یا اور کچھ نہیں تو موت ہی کی آخری گھڑی ان پہنچی جس سے بہر حال کسی کو مفر نہیں، تو اس وقت عیشِ دنیا کے یہ چند سال آخوان کے نیے کیا مفید ثابت ہونگے؟

۳۵ یعنی جب انہوں نے خبردار کرنے والوں کی تنبیہ اور سمجھانے والوں کی نصیحت قبول نہ کی اور ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، تو ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا۔ ظلم تو اُس وقت ہوتا جب کہ ہلاک کرنے سے پہلے انہیں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہوتی۔